الحمد

علامہ سہیل آفندی صاحب، حیدرآباد

قرآن حکیم کا ہر سورہ فصاحت و بلاغت کا ایک ناقابلِ انکار معجزہ اور ایک لازوال شاہکار ہے اور اس کے علاوہ ہر سورہ چند انفرادی خصوصیات کا بھی حامل ہے چنانچہ سورۂ فاتحہ میں بھی جو نمایاں امتیازات پائے جاتے ہیں ان میں سے چند یہاں بیان کئے جارہے ہیں۔

سات آیات پر مشتمل یہ وہ عبارت ہے جو تعداد کے اعتبار سے پوری دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے اور دہرائی جاتی ہے کیوں کہ ہر مسلمان پر دن کی سترہ واجب رکعتوں میں کم از کم دس رکعتوں میں اس سورہ کی تلاوت لازمی ہے اور جزو نماز ہے۔ اتنی عظیم تعداد میں دنیا کی کسی زبان کی کوئی عبارت نہیں دہرائی جاتی۔ نزول کے بعد سے آج تک کتنی بار یہ سورہ پڑھا گیا ہے اس کا اندازہ لگانا ہماری ذہنی صلاحیتوں سے ماورا ہے اور ابھی قیامت تک اور کتنی بار پڑھا جائے گا اس کا اندازہ لگانا اور بھی دشوار ہے۔ اب اس سورہ کی اہمیت اور معنویت کا اندازہ اسی سے کر لیجئے کہ مشیت نے اسے ہر نماز کا جز و لازم قرار دے کر ہر مسلمان پر اس کا حفظ واجب کر دیا ہے یعنی قدرت یہ چاہتی ہے کہ مسلمان اپنے سفر حیات کے کسی قدم پر ان سات حقائق و معارف سے غافل نہ رہے جو اس سورۂ مبارکہ کی سات آیتوں میں سمودیئے گئے ہیں۔ اور حسب توفیق واستطاعت ان کا ادراک کر کے راہِ عرفان میں آگے بڑھتا رہے۔

اس سورۂ مبارکہ کی ایک اہم امتیازی شان یہ ہے کہ اس کی سات آیتوں نے قرآن حکیم کو سات ابواب میں معجزنما انداز سے تقسیم کر دیا ہے۔ یعنی تمام آیاتِ قرآن کو سات حصوں میں اس طریقہ سے تقسیم کیا جاسکتا ہے کہ ہر حصہ کا عنوان اس سورۂ مبارکہ کی ایک آیت کو قرار دیا جا سکے۔ ایسا محسوس ہوگا کہ ان سات حصوں میں سے ہر حصہ سورۂ فاتحہ کی اس آیت کی تفسیر کر رہا ہے جسے عنوان قرار دیا گیا ہے، بالفاظ دیگر سورۂ فاتحہ قرآن مختصر ہے اور قرآن حکیم کے باقی ایک سو تیرہ سورے اس قرآن مختصر کی تفسیر ہیں۔ طالب علم قرآن خود یہ تجربہ کر کے دیکھ لے۔ جہاں سے چاہے قرآن پڑھنا شروع کر دے۔ اگر قدرے فکر اور تدبر سے کام لیا تو یہ حقیقت اس پر واضح ہوتی چلی جائے گی کہ ہر آیت بلا استثناء سورۂ فاتحہ کی کسی نہ کسی آیت سے مربوط ہے۔ جیسے جیسے وہ اس تجربہ میں آگے بڑھے گا اس پر وجد کی کیفیت طاری ہوگی اور روح کی بالیدگی اور ذہن کی روشنی میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، کتابِ الٰہی کی عظمت کا احساس لحہ بلحہ بڑھتا رہے گا۔ ہوسکتا ہے کہ بعض مقامات پر وہ آیات قرآن اور سورۂ فاتحہ کی آیتوں کے درمیان کوئی رابطہ محسوس نہ کر سکے۔ ایسے موقوں پر مزید تدبر و تفکر چھپے ہوئے رابطہ کو ظاہر کر دے گا اور اگر اس مرحلہ میں بھی ناکامی ہو تو ان مقامات کو ان مستثنیات میں شمار کیا جا سکتا ہے جن سے قاعدۂ کلیہ اور محکم ہو جاتا ہے۔ بہر حال آیاتِ قرآن کی بھاری اکثریت کا آیات سورۂ فاتحہ سے رابطہ ایک ناقابل انکار حقیقت ثابت ہو جائے گی اور اب ان حقائق کے پیش نظر ہم ایک اہم نتیجہ نکالنے کے موقف میں ہیں۔ یہ نتیجہ ہمارے تدبر فی القرآن کا حاصل ہوگا جس کا حکم حق سبحانہ تعالیٰ نے دو آیاتِ قرآنی میں دیا ہے (اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ یعنی کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ یہ آیت سورۂ نسا اور سورۂ محمدؐ میں آئی ہے) اور

چونکہ یہ نتیجہ بر بنائے آثار وشواہد نکالا ہے اور استدلال منطقی پر مبنی ہے لہٰذا اسے بالرائے نہیں کہا جا سکتا۔ ہم نے اس مقابلہ میں یہ احتیاط شروع سے آخر تک پیش نظر رکھی ہے کہ ہم تفسیر بالرائے کی حدود سے دور رہیں اور وہ بھی اس احساس کے ساتھ کہ ذہن بشر خطائے فکری سے محفوظ و مامون تو نہیں ہے لیکن عمل کا انحصار خلوص نیت پر ہے اور قادر مطلق دلوں کا حال بخوبی جانتا ہے۔

اور وہ نتیجہ یہ ہے کہ سورۂ قدر میں جو ارشاد رب العزت ہے کہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ یعنی ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ شب قدر میں (۲۳ رمضان المبارک) یہی سورہ جو قرآن کا لب لباب ہے۔ اور قرآن مختصر ہے نازل ہوا اور پھر اسی قرآن مختصر کی تفسیر قرآن مفصل کی صورت میں تیئیس سال تک نازل ہوتی رہی جس کا آغاز اِقۡرَاء بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ سے ہوا اور جسے عام طور پر پہلی تنزیل مانا جاتا ہے اس کے علاوہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ میں اور سورۂ اقراء کی پہلی آیت میں یعنی اِقۡرَاء بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ (پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے کائنات کو خلق کیا) میں ایک بے حد معنیٰ خیز رابطہ بھی ہے۔ رسول عالمیاںؐ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اے ہمارے حبیب! پڑھو۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ''اقرا'' سے پہلے کوئی جزو قرآن نازل نہیں ہوا تھا تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ رسولؐ اس حکم قرأت کی تعمیل کیسے کریں گے؟ کیا پڑھیں گے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ اسی سورۂ ''اقرا'' کی بعد والی آیات کی تلاوت کا حکم دیا جا رہا ہے تو یہ توجیہ بھی اشکال سے خالی نہیں کیوں کہ علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ پہلی وحی میں اس سورہ کی صرف پانچ ابتدائی آیات نازل ہوئیں (مالم یعلم تک) جو صرف تمہ ہیں پہلی آیت کا اور پھر کچھ عرصہ تک نزول وحی کا سلسلہ بند رہا لہٰذا کم از کم دوسری وحی کے نزول تک کوئی ایسی آیات موجود نہ تھیں کہ حضورؐ اس کی تلاوت فرماتے، چنانچہ ہمارا یہ سوال باقی رہتا ہے کہ حکم قرأت کی تعمیل سرکار ختمی مرتبت کیسے کریں؟ اور اگر ہم اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ سے مراد لے لیں کہ شب قدر میں سورہ فاتحہ جو قرآن مختصر ہے نازل ہو چکا تھا تو اب حکم قرأت کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ قرآن مختصر موجود ہے اور سرکار ختمی مرتبت کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اے ہمارے حبیب اس قرآن مختصر کو پڑھو (نمازوں میں اور بغرض تبلیغ و تفہیم)۔ بات واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن کے شبِ قدر میں نازل ہونے سے متعلق جتنی توجیہات پیش کی گئی ہیں ان میں یہ توجیہ سب سے زیادہ ''قرین قیاس'' ہے۔

اور دوسرا اہم مسئلہ جو واضح ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم** وحی متلو بھی ہے اور جزو سورۂ فاتحہ بھی۔ اس مسئلہ پر بھی طویل بحثیں ہوئی ہیں۔ آیئے ہم بھی اس پر تدبر کریں۔ رسول اکرمؐ کو حکم ہوتا ہے کہ پڑھو! اور اس تاکید کے ساتھ کہ اپنے پروردگار کے نام سے قرأت کا آغاز کرو۔ چونکہ حکم کے نزول کے وقت سوائے سورۂ فاتحہ کے اور کوئی عبارت قابل قرأت نہیں اور تاکید رب العزت یہ ہے کہ اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ یعنی اپنے پروردگار کے نام سے پڑھو۔ تو اب سورۂ فاتحہ کی پہلی تلاوت کا آغاز بحکم اللہ سبحانہ وتعالیٰ 'بسم اللہ' سے ہوگا اگر چہ سورۂ فاتحہ کی آیت میں بھی اسم ذات آیا ہے (**الحمد للہ رب العٰلمین**) لیکن یہ حمد مطلق ہے، نہ کہ تعمیل حکم۔ ''**اقرا باسم ربک**'' اور بسم اللہ کا رابطہ دیدنی ہے۔ اس نے حکم دیا کہ اپنے رب کے نام سے پڑھو اور ہم نے تعمیل کی کہ **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم** یعنی اللہ کے نام سے (ہم قرأت کا آغاز کرتے ہیں) جو رحمٰن ہے رحیم ہے۔ یہ وہ تفہیم ہے جس کو ذہن قبول کر لیتا ہے اور کوئی عقلی موالغات ہمارے سامنے نہیں آتے اور اب ہم **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم** کے وحی متلو ہونے پر مختصر بحث کریں گے کیوں کہ اس پر بھی طویل بحثیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری دلیل حرف آخر ہو جائے۔ آیئے ہمارے ساتھ چلیئے۔ کتاب حکیم اٹھا کر سورۂ نمل نکالئے۔ یہ اس کتاب حکیم کا ستائیسواں سورہ ہے۔ آیت نشان تیس (۳۰) کی تلاوت کیجئے۔ پوری **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم** موجود ہے ظاہر ہے کہ

پورا سورۂ نمل وحی متلو ہے۔ جب ''کل'' جزو متلو ہوا تو جزو کا وحی متلو ہونا لازم قرار پایا۔ اور اگر اب یہ گنجائش نکالی جاتی ہے کہ سورۂ نمل کی مذکورہ آیت میں ''بسم اللہ'' وحی متلو ہے اور قرآن کے باقی ایک سو تیرہ مقامات پر یہ وحی نہیں ہے تو عقل سلیم اس کو قبول نہ کرے گی کہ ایک ہی جملہ وحی بھی ہو اور غیر وحی بھی لہٰذا ثابت ہوا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وحی متلو بھی ہے اور سورۂ فاتحہ کا جزو لازم بھی۔

یہ ہے اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت اور سورۂ بقرہ کے آغاز سے لے کر آخری سورہ ''والناس'' تک جن جن آیتوں میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا ذکر آیا ہے، اس کے رحم وکرم اور رحمانیت کا بیان ہے، اس کے کرم اور عنایات غفاری، عفو وعطا، بخشش، جنت کی نعمتوں اور بہاروں، دنیاوی رحمتوں کا ذکر آیا ہے وہ سب آیتیں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر ہیں، ان تمام آیات نعمت و رحمت کو جمع کر لیں تو یہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر بن جائے گی۔ ایسی آیتوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پر اتنی گفتگو کو اپنے نقص علم کی مجبوری کے سبب بادل نخواستہ کافی سمجھتے ہوئے ہم دوسری آیت پر گفتگو کا آغاز کر رہے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کے قرآن مختصر ہونے پر مولائے متقیان علیؑ ابن ابی طالبؑ کا ایک ارشاد گرامی یاد آگیا۔ فرماتے ہیں کہ جو کچھ قرآن میں ہے، وہ سورۂ فاتحہ میں ہے اور جو کچھ سورۂ فاتحہ میں ہے، وہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' میں ہے اور جو کچھ 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' میں ہے وہ (ب) کے نقطہ میں ہے اور میں وہ نقطہ ہوں جو (ب) کے نیچے لگایا جاتا ہے۔ مولاؑ کے اس قول نے ہمارے تدبر کو اور واضح کر دیا اور پھر یہ بھی یاد دلاتے چلیں کہ مولاؑ نے ارشاد فرمایا کہ اگر چاہوں تو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی تفسیر سے ستر اونٹ لاد دوں۔ یہ ہے اس کی شان جو 'علم کتاب' کا حامل ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

یہ اس سورۂ مبارکہ کی دوسری آیت ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ 'ساری تعریف اللہ کے لئے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے'۔ لیکن یہ ترجمہ ناقص ہے اور تمام ترجموں کو اپنے عجز کا اعتراف ہے۔ اس آیت کا پہلا کلمہ ''الْ'' بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور ساری تعریف کے الفاظ 'الحمد' کے مفہوم کو ادا نہیں کرتے لہٰذا ''الْ'' کے مفہوم کو واضح کرنا بہت ضروری ہے۔ ''الْ'' کا منشا یہ ہے کہ ہر تعریف فرداً فرداً اور تمام تعریفیں بہ حیثیت مجموعی اسی ذات واجب محمود مطلق کے لئے ہیں۔ وہ محمود مطلق ہے، تمام صفات حمیدہ کا مرجع وہی ہے۔ ہر حسن وکمال کی خالق اسی کی ذاتِ واجب ہے۔ ممکنات میں، موجودات میں، مخلوقات میں، زمان ومکان کے کسی حصہ میں جب بھی، جہاں بھی حسن وکمال کا ظہور ہو، اس کا مرجع اسی کی ذات ہے۔ وہ کمال مادی ہو یا غیر مادی، وہ حسن جسمانی ہو یا روحانی۔ اس کا خالق وہی رب العالمین ہے اور کوئی بھی شے ساری تعریف کی یعنی ''الحمد'' کی مستحق اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس میں چھوٹے سے چھوٹے کسی عیب یا نقص کا شائبہ تک نہ پایا جائے، چونکہ اگر ذرا سا بھی نقص پایا گیا تو چونکہ نقص قابل تعریف نہیں ہوتا، اس لئے ساری تعریف نہیں کہی جا سکے گی اور یہ تعریف بقدر حسن وکمال رہ جائے گی۔ نقص کا وجود اس شے سے 'ساری تعریف' کا استحقاق چھین لے گا اور صرف جزوی اور محدود تعریف کا مستحق بنا دے گا اور چونکہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی ذاتِ واجب کے سوا کائنات کی ہر شے ممکن الوجود ہے لہٰذا ہر شی میں ''نقص امکان'' لازمی طور پر پایا جاتا ہے اور 'یہ نقص امکان' 'ساری تعریف' کے استحقاق سے اسے محروم کر دیتا ہے۔

کائنات کی ہر شے اپنے وجود میں ذاتِ واجب کے ارادہ کی محتاج ہے۔ اور محتاجی نقص ہے لہٰذا کوئی شے 'ساری تعریف' کا استحقاق نہیں رکھتی۔ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ چونکہ واجب الوجود ہے یعنی اپنے وجود کے لئے اپنے غیر کا محتاج نہیں، یعنی صمد ہے، بے

نیاز ہے، ’لم یلد‘ ہے، ’ولم یولد‘ ہے، نقص امکان سے پاک و پاکیزہ ہے، غنی مطلق ہے، محمود مطلق ہے، لہٰذا وہ ساری تعریف کا مستحق ہے، شے کا حادث ہونا یعنی عدم سے وجود میں آنا یا وجود سے عدم میں چلا جانا نقص ہے اور الحمد کا اَلْ یہ اعلان کر رہا ہے کہ اللہ حادث نہیں۔ تغیر نقص پر دلالت کرتا ہے اور اَلْ کا منشا یہ ہے کہ اللہ کی ذات واجب ہر قسم کے تغیرات اور نقل مکانی سے بالا تر ہے۔ اسی دلیل سے تمام نقائص وعیوب سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا پاک و پاکیزہ ہونا واضح ہو گیا اور جسم چونکہ لازمی طور پر محدود ہوتا ہے اور محدود ہونا نقص ہے، محتاجی ہے، لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ جسم و جسمانیات سے منزہ ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ الحمد کے کلمۂ ’اَلْ‘ نے تمام صفات سلبیہ کی نفی کر دی اور ’’حمد‘‘ نے تمام صفات حسن وکمال یعنی صفات ثبوتیہ کے لزوم کا اعلان کر دیا۔ ایک لفظ ’’الحمد‘‘ نے ان مفاہیم کو اپنے میں سمیٹ لیا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات واجب الوجود ہے، وہ قادر مطلق ہے، ازلی ہے، ابدی ہے، سرمدی ہے، حی بالذات ہے، قیوم بالذات ہے، رزاق کائنات ہے، رحیم وکریم ہے، غفار ہے خلاق ممکنات ہے، ہر قسم کے نقص و عیب سے کلیۃً پاک و پاکیزہ اور منزہ ہے، اس کی ذات وصفات لامحدود ہیں، تمام کمالات کا مظہر ہے۔

اب قرآن حکیم کی ان تمام آیات پر نظر ڈالئے جن میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے ذات وصفات کا ذکر کیا ہے۔ ان آیات کریمہ کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ان آیات کی توجہ کے ساتھ تلاوت کریں تو یہ محسوس ہوگا کہ ان تمام آیاتِ کریمہ کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ ان آیات کی توجہ کے ساتھ تلاوت کریں تو یہ محسوس ہوگا کہ یہ تمام آیاتِ کریمہ الحمد للہ رب العٰلمین کی تفسیر کر رہی ہیں۔ اور ایک بار پھر یہ حقیقت ابھر کر ہمارے سامنے آئے گی کہ سورۂ ’’الحمد‘‘ قرآن مختصر ہے اور باقی سورے اس قرآن مختصر کی تفسیر ہیں۔

اور چونکہ وہ تمام ممکنات کا خالق ہے اور ہم جزو ممکنات ہیں، لہٰذا ہماری حیات، ہمارا جسم اور اس جسم نامی کی قوتیں اور صلاحیتیں، ہماری عقل، ہمارا ذہن، ہمارا شعور، لاشعور، تحت شعور، ہماری قوت فکر وادراک جس کا صرف ناقص کر کے ہم اس کے وجود کا انکار کرنے کی گستاخی کرتے ہیں، سب اس کے ارادہ کا مظہر اور اس کے اشارۂ تکوینی کا نتیجہ ہیں اور ہماری روح بھی اسی کے حکم سے قبض کی جائے گی۔ لہٰذا عقل سلیم اور صحت مند ذہن کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم اس کی اطاعت کریں۔ اسی کی عبادت کرتے رہیں۔ اس کی حمد وثنا سے اپنی زبان کو تر رکھیں۔ اس کے شکر سے کبھی غافل نہ رہیں۔ اسے پہچاننے کی کوششیں تاحیات کرتے رہیں۔ اس کے تمام احکامات پر حتی الامکان عمل پیرا رہیں۔ دوسروں کو اسی ضابطۂ حیات کی ترغیب دے کر انہیں ان کے فرائض یاد دلاتے رہیں اور اس کے ان منتخب اور برگزیدہ بندوں کا احسان مانیں۔ ان سے اپنی پرخلوص عقیدت وابستہ رکھیں جنہیں اس قادر مطلق نے ہماری ہدایت کے لئے پیکر بشریت میں اس دنیا میں بھیجا۔

آپ نے غور فرمایا؟ یہ تمام نتائج اور تاثرات عقلی ہیں، منطقی ہیں اور لازمۂ فکر وادراک ہیں، اور الحمد للہ رب العٰلمین پر تدبر اور تعمق کا حاصل ہیں۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اللہ سبحانہ وتعالیٰ عالمین کا پردگار ہے۔ یہ ترجمہ بالکل صحیح ہوگا لیکن اس کا ایک اور ترجمہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور وہ بھی الفاظ و کلمات کے اعتبار سے بالکل درست ہوگا۔ ان دونوں ترجموں کا انحصار ’’عالمین‘‘ کے مفہوم کی تعبیر پر ہے۔ عالمین کو اگر عالم کی جمع مانا جائے تو ترجمہ یوں ہوگا کہ ’سارے جہانوں کا پروردگار‘ یعنی کائنات میں ہمیں جتنے جہانوں کا علم ہو چکا ہے اور جتنے جہانوں کا علم ابھی نہیں ہوا ہے، ان سب کا پروردگار، اس طرح وہ خالق ہے تمام ستاروں کا، سیاروں کا، کہکشانوں کا، فضائے بسیط کے کناروں پر نظر آنے والے پر اسرار اور حیرت انگیز اجرام فلکی ’’کواسار‘‘ اور ’پلسار‘ نکلا کا پر اسرار اور پر ہیبت بلیک ہولس (Black Holes) کا۔ اور اگر ’’عالمین‘‘ کو ’عالمی‘ کی جمع مان

لیا جائے تو ترجمہ یوں ہوگا ''کائنات کے تمام ذی حیات مخلوقات کا رازق اور مزلی (تربیت دینے والا)۔ اس ترجمہ سے یہ مفہوم نکلا کہ حق سبحانہ تعالیٰ کائنات کی ہر ذی حیات مخلوق کا، خواہ وہ کائنات کے کسی گوشہ میں، کسی کرے پر، کسی کہکشاں میں موجود ہونا، صرف رازق ہے بلکہ ان کا تربیت دینے والا بھی ہے، یعنی جس ذی حیات میں اس نے تربیت کے قبول کئے جانے کی صلاحیت رکھی ہے، ان کے لئے وہ سامانِ ہدایت و تربیت بھی فراہم کرتا ہے۔ اسی مفہوم کو واضح کرنے کے لئے لفظ 'رب' کا صرف کیا گیا اور 'الٰہ العالمین' نہیں کہا گیا۔ ہم بنظر اختصار اپنی گفتگو کو انسانوں تک محدود رکھیں گے ورنہ یہ مقالہ بے انتہا طویل ہو جائے گا۔ تو چونکہ انسانوں میں عقل سلیم، مشاہدہ، تجربے اور ادراک کلیات کی قوتیں موجود ہیں لہٰذا انسان ہدایت اور تربیت کے قبول کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے اور تربیت کا مقصد ہے درجۂ کمال تک پہنچانا اور چونکہ وہ رب ہے لہٰذا لازمی طور پر اس نے ہمارے لئے یعنی بنی نوعِ انسان کے لئے سامان تربیت فراہم کیا جو ہمارے سامنے ہے۔ اس قادر مطلق نے ہماری حیاتِ طبعی کو برقرار رکھنے کے لئے ہمارے نظامِ جسمانی کی تشکیل کی اور ہماری غذا کی فراہمی کے لئے زمین میں روئیدگی کی قوت پیدا کر دی۔ اس کا یہ رحم و کرم بہ حیثیت 'رب' ہم پر ہزاروں، صدیوں سے جاری و ساری ہے اور یہ صرف جسمانی تربیت کا ذکر ہوا لیکن لفظ ''رب'' آیت میں مطلق حیثیت سے آیا ہے، لہٰذا تربیت کا ہمہ جہتی ہونا بھی ضروری ہوا اور ذہنی تربیت بھی لازم آئی اور اس ذہنی تربیت کے لئے اس نے انبیاء و مرسلین کو بھیجا۔ قارئین کرام اس گوشہ کو ذہن میں محفوظ رکھتے ہوئے آگے بڑھیں کہ آیات پر تدبر کے طفیل ہم حقائق و معارف کی کن کن منزلوں سے گذر رہے ہیں اور یہ کہ مذکورہ حقائق و معارف صرف ایک آیت الحمد للہ رب العلمین پر تدبر کا ثمرہ ہیں۔ اندازہ کریں کہ پورے قرآن کی تقریباً ساڑھے چھ ہزار آیتوں پر تفکر کا اگر موقعہ ملے تو معرفت کی کیا منزل ہو چونکہ ایک حیات طبعی تو درکنار ہزاروں صدیوں میں بھی اس تدبر کی تکمیل ناممکن ہے اس لئے علامہ اقبالؒ نے کہا:۔

صد جہاں باقیست در قرآں ہنوز

اندر آیاتش یکے خود رابسوز

یعنی قرآن میں سو کائناتیں پنہاں ہیں ان سب کے مشاہدہ کے لئے عمر خضر بھی ناکافی ہے لہٰذا اے قرآن کے طالب علم تو قرآن کی کسی ایک آیت کی گرمی میں اپنی روح کو جلا دے یعنی صرف ایک آیت کو سمجھنے کے لئے اس آیت کو پورے جلال و جمال میں کمال میں دیکھنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے کہ یہ تیری حیاتِ مستعار کا ایک صرف صحیح ہوگا۔

چلئے اب پھر رشتۂ فکر کو لے کر وہیں سے آگے بڑھیں جہاں سے چھوڑا تھا۔ اس نے ہماری ہدایت کے لئے انبیاء و مرسلینؑ بھیجے اور چونکہ استکمال کے لئے ہدایت کا نقائص سے پاک ہونا ضروری تھا۔ لہٰذا انبیاء مرسلینؑ کا معصوم ہونا بھی لازم آیا کیوں کہ اگر انبیاء معصوم عن الخطا نہ ہوں تو ہدایت و تبلیغ میں خطا کا امکان رہے گا۔ اور اگر ہم نے ناقص ہدایت پا کر خود کو گمراہ کر لیا تو اس گمراہی کی ذمہ داری ہم پر نہ ہوگی بلکہ ہادیوں کے نقص ہدایت پر جائے گی اور چونکہ محمود مطلق کی طرف سے ایسا ناقص انتظام ہونا محال ہے، اس لئے عصمتِ انبیاؑء نہ صرف سرمایۂ اعتقاد ہے بلکہ لازمۂ عقل بھی ہے۔ اللہ رے وسعتِ مفہومِ آیاتِ قرآنی، دو کلمات (رب العلمین) نے انبیاء کی بعثت بھی ثابت کر دی اور عصمت بھی۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس نے ہماری تربیت کا ذریعہ ہماری عقل سلیم کو قرار دیا اور انبیاؑء کے وجود بعثت و عصمت کا لزوم باقی نہ رہا۔ تاریخ عالم پر ایک سرسری نظر ڈال لیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ انسانوں کی خطائے فکری نے ماضی میں خون اور آنسوؤں کے کتنے دریا بہائے ہیں۔ آپ کی مذکورہ خوش فہمی فوراً ختم ہو جائے گی۔

اب جتنی آیات قرآن حکیم میں انبیاء کی بعثت اور ان کے سیرت و کردار کی وضاحت اور ان کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہیں

وہ دراصل اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی تفسیر کر رہی ہیں اور تفصیل کے ساتھ یہ بتا رہی ہیں کہ اس مربی حقیقی نے، اس رب العلمین نے ہماری ذہنی اور روحانی تربیت کا انتظام کیسے کیا اور اپنے کن منتخب بندوں کے ذریعے کیا اور ان ہادیان دین کے سیرت و کردار کیا تھے۔ اس موضوع پر قرآن حکیم میں ایک سرسری اندازہ کے مطابق ایک ہزار آیات موجود ہیں۔ جو سب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کی تفسیر ہیں۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یہ اس سورۂ مبارکہ کی تیسری آیت یعنی وہ ذات واجب اور محمود مطلق رحمان بھی ہے اور رحیم بھی۔ بظاہر یہ دونوں الفاظ مترادف یعنی ہم معنیٰ ہیں۔ اور مترادفات کا بغیر کسی سبب معقول کے صرف کرنا خلاف فصاحت ہے اور چونکہ یہ الفاظ بظاہر مترادفات ہیں لہٰذا دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ان کے صرف کا کوئی معقول جواز موجود ہے اور یا پھر یہ مترادفات نہیں ہیں بلکہ اپنے مفاہیم و معانی میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مفسروں نے اس مسئلہ پر قابل دادفکر کی ہے اور ان الفاظ کے صرف کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں لیکن ان توجیہات سے عقل کو اطمینان نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر یہ کہا گیا کہ ایک لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تمام مخلوقات پر رحم کرتا ہے اور دوسرے لفظ کا منشا یہ ہے کہ وہ مومنوں پر بہ طور خاص رحم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی چند توجیہات کو بیان کرنے کے بجائے اپنے تدبر کا نتیجہ بیان کئے دیتے ہیں تاکہ قارئین خود فیصلہ کر لیں۔

تاریخ یہ بتا رہی ہے کہ ظہور اسلام سے قبل عرب قومیں خصوصاً مکہ اور اس کے گرد و نواح میں رہنے والے عرب ذات واجب کو 'اللہ' کے نام سے جانتے اور 'رحمٰن' سے ان کا کوئی تعارف نہ تھا۔ تاریخ بھی اس امر کی شاہد ہے اور زمانۂ جاہلیت کے اشعار بھی۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو سورۂ فرقان کی آیت نشان (۶۰) میں بیان کر دیا ہے جو اس موضوع پر حرف آخر ہے۔ ارشاد ہوا۔ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَھُمْ نُفُوْرًا (۲۵ فرقان ۶۰) ترجمہ:۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ یہ رحمان کون ہے؟ کیا تم جسے کہو ہم اسے سجدہ کرنے لگیں؟ اور پھر ان کا حق سے فرار اور شدید ہو جاتا ہے۔'' اس سے ظاہر ہوا کہ مشرکین مکہ نہ صرف یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں رحمان کو شامل نہیں کرتے تھے بلکہ اس لفظ سے انہیں ایک طرح کی بیزاری تھی۔ چونکہ رحمان اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں شامل ہے۔ لہٰذا ظہور اسلام کے بعد یہ ضروری تھا کہ ان کی یہ غلط فہمی دور کر دی جائے اور ان کی مذکورہ بیزاری رفع ہو جائے لہٰذا پہلی آیت میں اللہ کے ساتھ رحمان لایا گیا۔ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اور واضح کر دیا گیا کہ جسے تم اللہ کہتے ہو وہ رحمان بھی ہے اور رحیم بھی۔ اگر ہم اسی وضاحت پر اکتفا کریں تو بھی معقول توجیہ ہمیں مل جائے گی کہ بظاہر دو مترادفات رحمان اور رحیم ایک ساتھ کیوں لائے گئے۔ رحیم کے ساتھ رحمان اس غرض خاص سے لایا گیا کہ اس اسم الٰہی سے مغائرت دور ہو جائے اور اللہ اور رحیم کو اس لئے ساتھ رکھا گیا کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ یہ تینوں اسی ذات واجب الوجود کے نام ہیں۔ لیکن رحمان کے ساتھ رحیم کے صرف کی یہ واحد توجیہ نہیں ہے۔ اب آپ دوسری دلیل ملاحظہ فرمائیں، جس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ رحمان اور رحیم مترادفات نہیں ہیں بلکہ رحمان اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا اسم ذات ہے اور رحیم اسم صفت۔

یہ لفظ رحمان جو بظاہر اللہ کا اسم صفت ہے، قرآن سے قبل نازل ہونے والے صحیفوں میں اللہ کے اسم ذات کی حیثیت سے آیا ہے اور اکثر علمائے یہود و نصاریٰ اسی وجہ سے لفظ رحمان سے متعارف تھے۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم میں لفظ رحمٰن ستاون مقام پر آیا ہے اور تقریباً ہر آیت میں اس کا صرف اسم ذات کی حیثیت سے ہوا ہے۔ ان آیات پر نظر ڈالنے سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے چنانچہ ارشاد ہوا: الرحمٰن علم القرآن (وہ رحمٰن جس نے قرآن سکھایا)

غور فرمایا آپ نے؟ یہاں کتنی قطعیت اور وضاحت کے ساتھ لفظ رحمٰن کو اسم ذات کی جگہ لایا گیا ہے۔ یہ سورہ شمارہ پچپن، الرحمٰن کی پہلی اور دوسری آیات ہیں اور اب سورۂ طٰہٰ کی یہ آیت (نشان ۹۰) بھی ملاحظہ کریں:۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ۔

ترجمہ: اور ہارون نے ان سے (بنی اسرائیل) سے پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ اے میری قوم تمہارا امتحان لیا گیا ہے اور حقیقت میں تمہارا رب رحمٰن ہے پس میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو۔'' یہاں واضح طور پر رحمٰن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسم ذات کی حیثیت سے صرف ہوا ہے۔ ''تمہارا پروردگار رحمٰن ہے'' ان الفاظ سے رحمٰن کا اسم ذات ہونا قطعیت کے ساتھ واضح ہو گیا ہے لیکن ایک آیت اسی سورۂ طٰہٰ کی اور سماعت فرمالیں۔ اس آیۂ کریمہ کا نشان ہے،(۱۰۹)۔ارشاد ہوتا ہے:۔

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا

ترجمہ: اس دن یعنی قیامت کے دن شفاعت کام نہ دے گی مگر اس کی جسے ''رحمٰن'' اجازت دے اور اس کے قول سے راضی ہو) یہاں بھی رحمٰن اسم ذات کی طرح صرف ہوا ہے۔اسی طرح پوری ستاون آیات میں یہ اسم الٰہی اسم ذات کی حیثیت سے صرف ہوا ہے اور اب ہم اس موضوع پر حرف آخر پیش کر رہے ہیں۔سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نشان (۱۱۰) میں ارشاد رب العزت ہے:۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى

ترجمہ: کہہ دوا ے ہمارے رسول کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو جس نام سے بھی تم اسے پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں) یعنی اسے اللہ کہو یا رحمٰن ایک ہی بات ہے۔اس آیۂ کریمہ نے قطعیت کے ساتھ ثابت کر دیا کہ رحمٰن اللہ تعالیٰ کا اسم ذات ہے اور یہ کہ سورۂ فاتحہ کی اس تیسری آیت میں حشو وزوائد تک کا شائبہ نہیں ہے کیوں کہ رحمٰن اور رحیم مترادفات نہیں ہیں بلکہ رحمٰن اسم ذات ہے اور رحیم اسم صفت۔

ایک اور تحقیقاتی گوشۂ فکر جو ہمارے سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ چونکہ لفظ رحمٰن دوسری آسمانی کتابوں میں اسم ذات کی حیثیت سے آیا ہے، قرآن کی معجز نما بلاغت کا ایک اور پہلو یوں روشن ہوتا ہے کہ قرآن کی جن آیتوں میں لفظ رحمٰن کا آیا ہے ان آیتوں میں جو کچھ کہا گیا ہے وہی دوسری آسمانی کتابوں میں بھی کہا جا چکا ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز التزام ہے اور قرآن کی اعجاز بیانی کی ایک معجز نما مثال اور اس کتاب کے الہامی ہونے کی ایک دلیل ہے۔ اس بلاغت کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ (بقرہ ۱۶۳) میں ارشاد ہوا: **وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ** (اور وہ تمہارا معبود برحق ایک ہی ہے اور اس رحمٰن ورحیم کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں) اس آیت میں بھی اللہ کے بجائے رحمٰن آیا ہے اور اب توریت کی کتاب خروج کے بیسویں باب کی تیسری آیت ملاحظہ ہو لایکن لك آلھة اخرىٰ (اللہ کے سوا تیرا اور کوئی معبود نہیں) اور پھر ملاحظہ فرمائیے متیٰ کی انجیل کے چوتھے باب کی دسویں اور گیارہویں آیات (یہاں لفظ آیات ہم نے اصطلاحی مفہوم میں صرف کیا ہے) جناب عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں۔ لانه مکتوب للرب الك تسجد واياه وحدة تعبد ترجمہ: کیوں کہ حقیقت میں یہ قانون بن چکا کہ تو نے اپنے رب اپنے معبود ہی کو سجدہ کرے اور صرف اسی وحدہ لاشریک کی عبادت کرے گا) نتیجہ یہ نکلا کہ کتب سابقہ میں اسی مفہوم کی آیات موجود ہیں جو مفہوم سورۂ بقرۃ کی آیت نشان ۱۶۳ میں واضح کیا گیا ہے اور جس میں لفظ رحمٰن اسم ذات کی طرح آیا ہے۔

اب ان تمام آیتوں پر نظر ڈالئے جن میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی رحمتوں کا مختلف عنوانوں سے ذکر کیا ہے جس میں رحیمی کا بیان اور رحمانیت کی شان نظر آتی ہے۔ یہ سب آیتیں ''الرحمٰن

الرحیم'' کی تفسیر بیان کر رہی ہیں اور ایسی آیتوں کی کافی تعداد کتاب حکیم میں موجود ہے۔ اس منزل پر تیسری آیت کے بارے میں اپنی گفتگو ختم کر کے سورۂ فاتحہ کی چوتھی آیت پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ

ترجمہ: اس آیۂ مبارکہ کا یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ روز جزا کا مالک ہے اور یہ ترجمہ سنتے ہی جو سوال ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ کہ اس معبود برحق نے اپنے ملکیت اور مالکیت کو روز جزا سے کیوں مخصوص کر دیا۔ اس کا مالک ومختار کل ہونا تو مسلمات میں سے ہے، اس کی حکومت تو ازل سے ابد تک ہے، مبدا سے معاد تک ہے اور تمام زمان و مکان پر محیط ہے، لامتناہی ماضی سے لامتناہی مستقبل تک زمان ومکان کا کوئی نقطہ ایسا نہیں ہے جو اس کی حکومت مطلقہ سے باہر ہو۔ تمام ممکنات، موجودات ومخلوقات اس کی مشیت اور اس کے اشارۂ تکوینی کے تابع ہیں اور کسی کی عدول حکمی محالات عقلی سے ہے تو یہ پھر کیوں ارشاد فرمایا کہ ''روز جزا کا مالک''؟ آیئے اس مسئلہ کو تدبر سے حل کرنے کی کوشش کریں۔

اکثر حیوان جمادات اور فرشتے اور کثیر مخلوقات بیشک اس کے مطلق اعتبار سے تابع فرمان ہیں اور انسان پر بھی وہ اختیار مطلق رکھتا ہے، ہر انسان کا وجود وعدم وجود اور ہست و بود اس کی مشیت کے تابع ہے لیکن اس کی مشیت نے انسانوں کو ایک مدت معین کے لئے فاعلِ مختار بنایا ہے تا کہ انسان اپنے ارادہ اور اپنی نیک نیتی سے راہ حق اختیار کرے یا ہدایت پا جانے کے باوجود اپنی شامتِ اعمال سے راہِ ضلالت اختیار کرے تا کہ اس کے اعمال کی بنا پر اس کی آخرت کا مدار رہے اور یہ دنیا اس کے لئے ایک منزل امتحان ہو۔ پروردگار عالم نے انسان کی اس حریت ارادہ کا اعلان اپنی کتاب حکیم کی متعدد آیات میں کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ دہر کی آیت نشان (۳) میں ارشاد ہوا اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (ہم نے انسان کو راستہ دکھایا اب خواہ وہ راہِ شکر اختیار کرے یا راہ کفر) تو چونکہ انسانوں کو مہلت عمل مل چکی ہے اس لئے وہ سفر حیات میں آزاد اور خود مختار ہیں اس آزادی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد اس کے احکام و ہدایات کی پابندی نہیں کرتی اور اس حقیقت کو بھول جاتی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کا مالک حقیقی ہے۔ انسانوں کی یہ جماعت دوسروں کو اپنے مالک کا درجہ دے دیتی ہے اور اس گمان ناقص میں مبتلا رہتی ہے کہ خود اس کے خود ساختہ مالکان ہی اس کے مالکان حقیقی ہیں، یہ جو دنیا میں عہد ہابیل سے لے کر آج تک خون اور آنسوؤں کے دریا بہے ہیں اور اللہ کے نیک بندے ہولناک آلام ومصائب میں مبتلا رہے ہیں اس کا یہی سبب ہے کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد نے اس کی ملوکیت کو نظر انداز کر کے اپنی نفسوں کو اپنی خواہشات کی غلامی میں دے کر ظلم وجور کی راہ پر خود کو آگے بڑھا دیا۔

مجھ پہ اللہ کے بندوں ہی نے توڑے ہیں ستم
میں یہ کہتا رہا اللہ کا بندہ ہوں میں

انسان کے علاوہ مالکان مجازی کی بھی کثیر تعداد ہے۔ ہر انسان کے متعدد مجازی مالکان ہوتے ہیں۔ ان مالکوں کی فہرست بڑی طویل ہے، مثال کے طور پر سربراہ حکومت اور افسرانِ بالادست وغیرہ اور خاندانِ کے بزرگ، ان سب کو کچھ نہ کچھ سماجی، قانونی، اور شرعی حقوق مالکانہ حاصل ہوتے ہیں اور ان کے حقوق مالکانہ کا خیال کرنا بجا طور پر ضروری بھی ہوتا ہے۔ بہر حال ناجائز مالکوں اور سماجی مالکوں کی حکمرانی میں انسانوں کی ایک کثیر تعداد زندگی بسر کرتی ہے۔

لیکن قیامت کے دن جو روز جزا ہوگا یعنی یوم الدین ہوگا، اس دن آج کے اور کل کے ماضی کے اور مستقبل کے تمام نمرود نیرو اور فرعون بے اختیار ہو جائیں گے۔ اپنے اپنے دور کے تمام چنگیز و ہلاکو اس مالک حقیقی یعنی مالک یوم الدین کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے سر جھکائے انتہائی بے بسی کے عالم میں کھڑے ہوں گے اس دن کا وہی مالک ہوگا اور اس مالک حقیقی

کی آواز بلند ہوگی "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ" یعنی آج کس کی حکومت ہے؟" نہیں، یوں نہیں، بہتر ہے کہ آپ سورہ مومن کی آیات ۱۶ اور سترہ سن لیں، ارشا ہوا: "يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَئٌ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ . لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَاظُلْمَ الْيَوْمَ . اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ" ترجمہ: اور وہ دن جس دن وہ سب یعنی تمام انسان حاضر ہوں گے، ان کی کوئی بات اللہ سے چھپی ہوئی نہ ہوگی (ایک آواز بلند ہوگی) آج کس کی حکومت ہے۔ (جواب ملے گا) اللہ کی جو واحد وقہار ہے آج ہر نفس کو اس کے کئے کا بدلہ ملے گا آج ظلم نہیں ہوگا۔ بے شک اللہ بڑی جلدی حساب لینے والا ہے) اس جلالی آیت کے ایک ایک لفظ پر دھیان دے کر یوم حساب کا تصور کیجئے اور مالک یوم الدین کی تفسیر کو سمجھئے ارشاد ہوتا ہے "لَاظُلْمَ الْيَوْمَ" آج کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ آج سے پہلے انسان ایک دوسرے پر ظلم کرتے رہے، قتل و غارت کا بازار گرم رکھا، ملک گیری کی لالچ اور اقتدار کی ہوس میں تباہ کاریاں کیں، نفسانی اور شیطانی خواہشوں کی تکمیل کے لئے ہزاروں انسانوں کے حقوق تلف کئے لیکن آج ظلم نہیں ہوگا!

کیوں کہ آج یوم الدین ہے اور اس دن کا مالک وہ عادل حقیقی ہے جو اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ آج انصاف ہوگا ہر شخص کو اس کے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ جو جہنم میں ڈالے جائیں گے وہ بر بنائے عدل ڈالے جائیں گے کیوں کہ اللہ کا عذاب اس کا عدل ہے (جوشن کبیر فصل ۴۸) آج اس عادل حقیقی کی حکومت ہے جو اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ ازل سے ابد تک اسی کی حکومت ہے۔ آج اس کے ہی بندے کامیاب ہوں گے اور اس کے عذاب سے نجات پائیں گے اور اس کی رضا کے مستحق ہوں گے جنھوں نے اپنی دنیاوی زندگی میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو اپنا مالک حقیقی مانا اور اس کے احکام کی اطاعت کرتے رہے اور اس پیمان محکم پر عمل کرتے رہے جو روز ازل اپنے معبود حقیقی سے کیا تھا اور اس کے سوا اور کسی کو اپنا معبود نہیں مانا اور علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق بنے رہے کہ

ہر کہ پیماں با ھوالموجود بست
گردنش از بند ہر معبود رست

(جس نے ذات واجب سے اپنے معاہدہ کو استوار رکھا، اس نے اپنی گردن تمام معبودان باطل سے چھڑائی) یہ وہ معاہدہ ہے کہ جو تمام بنی آدمؑ نے روز ازل کیا تھا جسے 'میثاق ازل' کا نام دیا جاتا ہے اور جس کا ذکر قرآن حکیم کے ساتویں سورہ 'اعراف' کی آیت نشان (۱۷۲) میں کیا گیا ہے: جب اس نے آدم کے بیٹوں کی روحوں سے اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا 'رب' نہیں ہوں اس وقت کس کی مجال تھی کہ اس کی حکومت سے انکار کرتا سب نے کہا کہ بیشک تو ہمارا رب ہے ہم گواہی دیتے ہیں اور پھر یہ تنبیہ بھی کر دی گئی کہ آج کے اس اقرار کو یاد رکھنا اور قیامت کے دن یہ نہ کہہ دینا کہ ہم اس صورتِ حال یعنی اپنی عبدیت اور رتیری الوہیت سے بے خبر تھے اور پھر قدرت نے یہ اہتمام بھی کر دیا کہ بندوں کو اپنے سفر حیات میں یہ معاہدہ بار بار یاد آتا رہے۔ قرآن حکیم کی متعدد آیتوں میں اس معاہدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ہم یہاں ایک اہم آیت کی طرف اپنے قارئین کی توجہ مبذول کریں گے یہ سورۂ یٰس کی آیت نشان (۶۰) ہے لیکن ہم اس کے بعد والی تین آیات بھی یاد دلائیں گے۔ ارشاد ہوا: اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ○ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِىْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ○ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ○ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ○ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ○ ترجمہ: اے آدم کے بیٹو! کیا ہم نے تم سے یہ اقرار نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرو گے وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور میری ہی عبادت کرو گے کہ یہ سیدھا راستہ ہے اس نے (یعنی شیطان نے) تمہاری اکثریت کو بہکا دیا کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

یہی وہ جہنم (تمہارے سامنے) ہے جس کی تم سے وعید کی گئی تھی۔ اپنے کفر کی پاداش میں آج اس میں داخل ہوجاؤ)

ان الفاظ کو بار بار پڑھئے اور ''مالک یوم الدین'' کی کیفیات کا اندازہ کرتے جایئے اور اب سورۂ مبارکہ انعام کی یہ دو آیتیں بھی جن کے نشانات (۳۰) اور (۳۱) ہیں، پوری توجہ سے ملاحظہ فرمائیں، فکر ونظر کو روشنی ملے گی اور یہ حقیقت واضح سے واضح تر ہوتی جائے گی کہ سورۂ فاتحہ قرآن مختصر ہے اور باقی (۱۱۳) سورے اس اجمال کی تفصیل ہیں۔ ارشاد ہوا: وَلَوْ تَرٰىٓ اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ○ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ○ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰىٓ اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ترجمہ: اور اگر تم انہیں (یعنی منکرین آخرت، منکرین یوم الدین) کو دیکھو جب کہ وہ اپنے رب کی پیشی میں کھڑے کئے گئے ہوں (ان کا پروردگار ان سے) کہے گا کہ کیا یہ (یوم دین اور حشر ونشر وغیرہ) حق نہ تھا؟ کہیں گے ہمارے رب کی قسم یہ حق تھا (اللہ سبحانہ تعالیٰ) فرمائے گا تو اب اپنے انکار حق کی پاداش میں عذاب (آخرت) کا مزہ چکھو۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی حضوری میں پیشی سے انکار کرنے والوں نے نقصان اٹھایا (اور اپنی گمراہیوں اور لہو ولعب میں پڑے رہے) یہاں تک کہ اچانک (یوم الدین والی) ساعت ان کے لئے آپہنچی (اور اب خواب غفلت سے چونکے تو) کہنے لگے ہائے افسوس ہماری غفلتوں پر وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پیٹھوں پر لادے ہوئے ہوں گے۔ جان لو کہ یہ بہت برا بوجھ ہے جو یہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ (ترجمہ ختم ہوا) یہ ہوگا ان کا انجام جنہوں نے اپنی دوروزہ زندگی میں اس کے مالک حقیقی ہونے سے انکار کیا تھا۔

اور قرآن ان خوش نصیبوں کا بھی حال بیان کر رہا ہے جنہوں نے اس قادر مطلق کی اطاعت و بندگی میں زندگی گذاری۔ سورۂ انبیاء کی آیات (۱۰۱) تا (۱۰۳) ملاحظہ فرمائیں: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰىٓ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ○ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ○ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ○ ترجمہ: جن لوگوں کو ہماری طرف سے (یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے) نیکیاں پہلے سے دی جا چکی ہیں وہ اس دن (جہنم سے) دور رکھے جائیں گے اس کی (جہنم کی) آہٹ بھی وہ نہ سنیں گے اور اپنی من مانی نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے (یوم الدین کا) عظیم خوف انہیں متاثر نہ کرے گا۔ فرشتے ان سے ملاقات (کا شرف حاصل) کریں گے۔ اور کہیں گے آج تمہارا دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا (ترجمہ ختم) یہ کون ہستیاں ہیں ان کا تعارف انشاء اللہ سورۂ فاتحہ کی آخری (ساتویں) آیت میں ہوجائے گا۔

اور اب ان تمام آیات پر نظر ڈال لیجئے جن میں قیامت کا ذکر ہے، حشر ونشر کا بیان ہے اور میدان حشر کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ اگر قارئین کو یہ تمام بیانات سن کر قرآن کے فکری مطالعہ کا شوق پیدا ہو چکا ہے تو ہم انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ مالک یوم الدین کی تفسیر سمجھنے اور تصویر دیکھنے کے لئے حسب ذیل آیات پر نظر ڈال لیں (۱) سورۂ طٰہٰ کی آیات (۱۰۲) تا (۱۱۲) (۲) سورۂ زمر کی آیات نشان ۶۸ تا ۷۵ (۳) سورہ نباء کی آیات ۳۸ تا ۴۰ اور سورۂ حج کی پہلی دو آیات۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد آیات قرآن حکیم میں یوم قیامت سے متعلق موجود ہیں۔ یہ تمام آیتیں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی تفسیر ہیں۔ سورہ فاتحہ کی اس بلاغت کی طرف سورہ ہود کی پہلی آیت میں بھی ایک لطیف اشارہ موجود ہے۔ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ (یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئی ہیں اور پھر ان کی تفصیل بیان کردی گئی ہے)

اور چوتھی آیت پر گفتگو ختم کر کے اب ہم سورۂ فاتحہ کی پانچویں آیت پر گفتگو کا آغاز کر رہے ہیں۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

ترجمہ: یوں ہوگا کہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے اور صرف تجھ ہی سے استعانت کرتے ہیں۔ آیت کی ابتدا حصر و تاکید سے ہے اور ذرا سا تدبر ہمیں آیت کے اس مفہوم کی طرف لے جائے گا کہ ہمارے معبود! ہم تیرے سوا کسی کو اپنا معبود نہیں مانتے اور تیرے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرتے، ہم اس عہد پر قائم ہیں جو روز اول ہم نے کیا تھا۔ ہم نے تیری حضوری میں تجھے اپنا رب مانا تھا اور تیری ربوبیت کی گواہی دی تھی۔ ہم اس عہد پر قائم ہیں اور لا الہ الا اللہ ہمارا محور حیات ہے، اس دنیا کی رنگینیاں ہمیں کتنا ہی اپنی طرف متوجہ کریں ہم تیری قائم کردہ حدود کے قریب بھی نہ جائیں گے، تیرے اوامر و نواہی کے پابند رہیں گے، دنیا سے اتنا ہی فائدہ اٹھائیں گے جتنی تو نے ہمیں اجازت دی ہے، اس سے آگے ہمارا قدم نہ بڑھے گا۔ ہمارا سفرِ حیات قرآن حکیم کی آیات اور تیرے منتخب بندوں کے ارشادات کی روشنی میں طے ہوگا۔ ہم تیرے حکم کے مطابق جو تو نے ہمیں سورۂ نساء کی آیت نشان ۵۹ رمیں دیا ہے تیری اطاعت کریں گے، تیرے رسولؐ ختمی مرتبتؐ کی اطاعت کریں گے اور اپنے امامؑ وقت کی اطاعت کریں گے۔ اے ہمارے معبود! ہم اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود نہ بنائیں گے۔ ہم دولت کی پرستش نہ کریں گے اور سرمایہ داروں کے آگے سجدہ ریز نہ ہوں گے۔ ہم تیری عبادت اس غرض سے نہیں کریں گے کہ ایک عبادت گزار عابد و زاہد کی حیثیت سے ہماری شہرت اور نیک نامی ہو بلکہ ہماری عبادات کا مقصد یہ ہوگا کہ ہمیں تیری رضا اور خوشنودی حاصل ہو ایاك نعبد !رب قدیر! ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تیری ہی عبادت کرتے رہیں گے۔ پروردگار! ہم تیری کتاب حکیم کے اوامر و نواہی کو یاد رکھیں گے تا کہ سفرِ حیات میں ہمارا قدم تیری مقرر کردہ حدوں سے باہر نہ جائے۔ ہمیں معلوم ہے کہ تیرے گمراہ بندوں نے دولت و ثروت، عیش و عشرت شہرت طلبی، اقتدار کی ہوس کو اپنا معبود قرار دیا اور اپنے ان ناجائز اور غیر انسانی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے تیرے بندوں پر مظالم توڑے۔ ان کے حقوق پامال کئے۔ انہیں لوٹا اور حاکموں کو رشوت دے کر خود کو محفوظ رکھا۔ الٰہی و سیدی! ہم نفسوں کے اس شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔

ہم نے اپنے عقل سے بھی تجھے وحدہ لاشریک جانا ہے اور تو نے اپنی وحدانیت کے روشن دلائل اپنی کتاب حکیم میں بھی بیان کر دیئے ہیں جنہوں نے ہماری عقلوں کو جگمگایا ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ یہ پوری کائنات ایک نظام اسباب و علل کی گرفت میں ہے اور کائنات کے کسی حصے میں کبھی کوئی خلل واقع نہیں ہوا اور ربط اشیاء میں کبھی کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی گئی۔ ایک ہی نظام اسباب و علل ہے جس کے تحت یہ کائنات چل رہی ہے۔ ہمارے اس مشاہدہ نے ہمیں اس حقیقت کا یقین دلایا کہ نظام اسباب و علل کی یکسانیت اور ہمہ گیری اس بات کا ثبوت ہے کہ ان قوانین کائنات اور نظام اسباب و علل کا خالق وحدہ لاشریک ہے اور قدرت کاملہ رکھتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا معبود (بفرض محال) ہوتا تو وہ اپنے جداگانہ قوانین کائنات اور نظام اسباب و عللخلق کرتا اور نظام کائنات میں لازمی طور پر خلل پڑتا، فساد پیدا ہوتا اور یہ حسین و مرصع مکمل اور متقن نظام درہم و برہم ہو جاتا۔ تو نے اپنی وحدانیت کی یہی دلیل اپنی ایک آیت میں بیان کی ہے جو ہمارے لئے مشعل راہ ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا یعنی اگر زمین و آسمان میں دو یا دو سے زیادہ خدا ہوتے تو زمین و آسمان میں فساد واقع ہو جاتا، بے شک تو وحدہ لاشریک ہے اور ہم تیرے سوائے کسی کو اپنا معبود نہیں مانتے اور تیرے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرتے۔ تیری وحدانیت کا ذکر قرآن حکیم سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ متی کی انجیل کے چوتھے باب میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ لا نہ

مکتوب للرب الھك تسجد و ایاہ وحدہ نعبد یعنی یہ قانونِ الٰہی لکھا جا چکا کہ اے انسان تو اپنے پروردگار معبود برحق کو ہی سجدہ کرے گا اور صرف اسی وحدہ لاشریک کی عبادت کرے گا۔ (ترجمہ ختم) تیرے غیر کو سجدہ توہین جبین ہے۔ توہین عبادت ہے۔ تیری ناراضگی اور عاقبت کی خرابی کا سبب ہے۔ پروردگارا! اِیَّاكَ نَعْبُدُ

یہ ہیں وہ تصورات جو اس آیۂ مبارک کے تدبر سے ایک قلب حساس اور چشم بینا میں ابھرتے ہیں اور جو لوگ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اپنا ولی یا مددگار قرار دے لیں۔ ان کے بارے میں سورۂ عنکبوت کی آیت نشان (۴۱) کافی ہے۔ ارشاد ہوا مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ترجمہ: جن لوگوں نے اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا کارساز بنالیا ان کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے اپنے لئے گھر بنایا اور گھروں میں سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے (ترجمہ ختم) غیر خدا پر توکل کرنے والا اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والے اس آیت کی روشنی میں اپنے موقف کو سمجھ لیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی میں ربط نہیں ہے، ایک مضمون کے بیان کے بعد اچانک ایک دوسرا مضمون شروع ہو جاتا ہے جس کا سابق مضمون سے کوئی ربط نہیں ہوتا، ایک موضوع کو تشنہ چھوڑ کر دوسرے بالکل مختلف موضوع کی آیات شروع ہو جاتی ہیں۔ ایسی ''بے ربطی'' کی مثالیں بھی دی جاتی ہیں اور اسی ضمن میں سورۂ فاتحہ کی زیر نظر آیت کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ سورہ کا آغاز غائب کے صیغوں سے ہوا۔ اللہ کو ساری تعریف کا مستحق مانا۔ اسے سارے جہانوں کا پروردگار گردانا اور مالک یوم الدین کہا۔ ابھی تک گفتگو واحد غائب کے صیغہ میں ہو رہی تھی کہ اچانک پانچویں آیت میں واحد حاضر کا صیغہ شروع ہو گیا اور ذاتِ واجب کو حاضر و ناظر جان کر اور اسے مخاطب کر کے گفتگو شروع ہو گئی لہٰذا یہ ربط و تسلسل کا فقدان ہوا۔

حیرت انگیز ربط آیات

ہم چونکہ سورۂ فاتحہ پر گفتگو کر رہے ہیں لہٰذا اسی سورہ کی حد تک ہم معترض کو جواب دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ صیغہ کی اس تبدیلی میں گہرا ربط ہے جسے معترض نے محسوس نہیں کیا۔ اس حیرت انگیز اور معجز نما رابطہ کا احساس اس وقت ہوگا جب بندہ اپنے آپ کو بارگاہ احدیت میں حاضر تصور کر کے پورے حضور قلب اور خشوع وخضوع کے ساتھ سورہ فاتحہ کی تلاوت کرے اور آیات کے مفہوم پر غور کرتا جائے یعنی یہ سمجھتا جائے کہ وہ اپنے پالنے والے کی جناب میں کیا کہہ رہا ہے۔ نماز کے ہر ذکر کو سمجھ کر پڑھنا ضروری ہے: ارشاد ہوا: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ○ یعنی نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک یہ نہ سمجھنے لگو کہ کیا کہہ رہے ہو (ترجمہ ختم) اس سے واضح ہوا کہ نماز کو سمجھ کر پڑھنا ضروری ہے۔ چنانچہ اب اگر آیات سورۂ فاتحہ کے مفہوم کو سمجھتے ہوئے تلاوت کی جائے تو نمازی خود کو اللہ کے حضور میں پائے گا۔ نماز کا مقصد ہی بارگاہ احدیت میں پیشی کے مترادف ہے۔ اس نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد اللہ کی حمد کی اور اس کی رحیمی اور رحمانیت کو یاد کیا (الرحمٰن الرحیم) اس وقت تک اس کے ذہن میں ذاتِ واجب کی صفات تازہ ہو گئیں۔ اس کی قدرتِ مطلقہ، جباری اور قہاری کا احساس ہوا اور اب نمازی نے کہا "مالك یوم الدین" یہ الفاظ زبان پر جاری ہوتے ہی میدان حشر کا وہ نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا جو آیات قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ نفسی نفسی کا عالم، واحد وقہار کا سامنا، جہنم کے حق ہونے کا احساس، میدان حشر ونشر کا خوف ناک ماحول، کسی بھی یار ومددگار کا فقدان، متقی سے متقی بندوں کے لرزہ براندام ہونے کی کیفیت، ہر نفس کو ہیبت وجلال الٰہی کا سامنا اور اس حقیقت کا حق الیقین کہ آج صرف انہیں کی نجات ہے جنہوں نے صرف اللہ واحد وقہار کی عبادت کی تھی، اس حقیقت کا احساس

کہ مشرکوں کے لئے جہنم مقدر ہو چکا، اگر خضوع وخشوع حقیقی ہے نماز میں خلوص ہے تو "مالک یوم الدین" کہنے کے بعد میدان حشر کی ہولنا کی اور اللہ کے ہیبت وجلال کی جو کیفیت اس پر طاری ہوگی اس کے پیش نظر تڑپ کر اس نمازی کا پکار اٹھنا کتنا فطری اور لازمی ہے کہ

اِیَّاکَ نَعْبُدُ

پالنے والے ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں، ہمیں عذاب جہنم سے محفوظ رکھ، ہمیں مشرکوں اور اپنے دشمنوں کے ساتھ محشور نہ کر۔ یہ ہے ربطِ آیات کا ایک معجزہ! مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کے بعد اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں جو صیغہ ہم نے بدلا ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر مخاطب ہوئے ہیں اسے بے ربطی نہیں بلکہ صنعت التفات کہئے۔

وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

اور صرف تجھ سے ہی مدد کے طالب ہوتے ہیں۔ تیرے سوا اور کسی سے اپنی مرادیں نہیں مانگتے۔ ہاں اگر تو نے اپنے کچھ منتخب بندوں کو خاص تصرفات اور اختیارات دیئے ہوں اور ان کے اس منصب و اعزاز کا ہم پر اظہار بھی کر دیا ہو اور پھر اپنی کتاب حکیم میں ہمیں یہ بھی ہدایت کر دی ہو کہ مجھ تک پہنچنے کے لئے وسیلہ اختیار کرو، ایسی صورت میں بے شک ہم تیرے ان منتخب بندوں کو طلب حاجات کا وسیلہ قرار دیں گے اور یہ تجھ سے استعانت کا ایک طریقہ ہوگا۔

چونکہ یہ مسئلہ بے حد اہم ہے اور غیر خدا سے حاجت طلب کرنے یا وسیلہ قرار دینے کے سلسلے میں بہت اختلافات ہیں، اس لئے ہم اس مسئلہ پر ذرا کھل کر گفتگو کریں گے۔

ہمارا سفر حیات بندوں سے مدد حاصل کئے بغیر طے نہیں ہو سکتا۔ منزل مقصود تک پہنچنا تو کجا، ہم چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔ ہماری اب تک کی زندگی بندوں کی مسلسل مدد کی مرہون منت ہے۔ شیر خواری کے زمانہ سے لے کر سنِ بلوغ تک ماں باپ اور بھائی بہن کی مدد اور محبت کے سہارے سے پہنچے۔

اگر ان بزرگوں کی توجہ شامل حال نہ ہوتی تو چند روز بھی زندگی کا تسلسل ممکن نہ تھا۔ ماں باپ کی مدد نے اسکول بھیجا۔ گریجوٹ ہونے تک اپنی کمائی کا سوال ہی نہیں تھا۔ بزرگوں کی روٹیوں پر پلے بڑھے اور انہیں کی امداد سے تعلیم پائی۔ ملازمت ملی تو وہ بھی رسوخ اور سفارشات کے طفیل، یہاں تک کہ پورے سفر حیات میں بندوں کی امداد، ہمدردی اور اشتراک وتعاون سے بے نیاز نہ ہو سکے اور حکم خدا سے ہر نماز میں یہی کہتے رہے کہ "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" بس ہم صرف تجھ ہی سے طالب امداد ہوتے ہیں اور حال یہ ہے کہ ایک دن بھی اس کے بندوں کی مدد کے بغیر نہیں گزار سکے آخر یہ مسئلہ کیا ہے؟ اور اگر اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا یہی مفہوم ہے کہ اس کے بندوں سے مدد نہ لی جائے تو ایک رات یہ طے کر کے سو جایئے کہ کل سے سوائے اللہ کے اور کسی سے طالب امداد نہ ہوں گے پھر دیکھئے کہ زندگی کس طرح گذرتی ہے۔ شام ہوتے ہوتے حالت خراب ہو جائے گی۔ امداد باہمی کے بغیر نہ خاندان کا کام چل سکتا ہے نہ سماج کا اور نہ ملک وقوم کا۔ اس کے علاوہ تاریخ ہدایت کی ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ انبیاء نے بھی بندوں سے مدد طلب کی ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ آلِ عمران کی آیت نشان (۵۲) فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (ترجمہ: پس جب عیسیٰ نے ان میں کفر کا احساس کیا تو کہا کہ اللہ کی راہ میں میری مدد (نصرت) کون کرے گا؟ (ترجمہ ختم) ثابت ہوا کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام نے بھی مدد طلب کی ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ توبہ کی آیت نشان (۴۰) میں ارشاد ہوا اِلَّا تَنْصُرُوْہُ فَقَدْ نَصَرَہُ اللّٰہُ یعنی اگر تم اس کی (رسولؐ ختمی مرتبت) مدد نہ کرو گے تو یاد رکھو کہ) اللہ نے اس کی مدد کی ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ تاکید کر رہا ہے کہ ہمارے رسولؐ کی نصرت کرو اور پھر کتنے بزرگان دین نے اللہ کے بندوں سے مدد طلب کی ہے۔ اس کی شہادت تاریخ ہدایت سے بھی ملتی ہے اور آیاتِ قرآنی سے بھی اور حضرت امام حسین علیہ السلام نے روز عاشورہ صدائے استغاثہ بلند کر کے

نصرت طلب کی ہے اگر چہ یہ استغاثہ امام حسین علیہ السلام کی کسی مجبوری کی بنا پر نہیں تھا بلکہ یہ مقامِ تعلیم میں عالمِ انسانیت کو آخری تنبیہ تھی کہ اب بھی اگر کوئی ظلمت سے نور کی طرف آنا چاہے تو یہ اس کے لئے آخری موقع ہے۔ مذکورہ حقائق کے پیشِ نظر یہ واضح ہو گیا کہ اللہ کے بندوں سے نہ صرف یہ کہ مدد طلب کی جا سکتی ہے بلکہ بزرگانِ دین نے مدد طلب کی ہے کس کی مجال ہے جو یہ کہہ سکے کہ یہ بزرگان دین (معاذ اللہ) اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے مفہوم سے بے خبر تھے۔

ممکن ہے کہ ہماری اس گفتگو کے جواب میں یہ کہا جائے کہ آیت زیرِ نظر میں استعانت کو اللہ سے مخصوص کیا ہے نہ کہ ''طلب نصرت'' کو یعنی اللہ کے بندوں سے نصرت طلب کی جا سکتی ہے لیکن استعانت کی ممانعت ہے کیوں کہ آیت میں نستعین ہے 'جوعون' کا مشتق ہے نہ کہ نصر کا اگر چہ یہ دلیل بہ ظاہر کچھ وزن رکھتی ہے لیکن آیات قرآنی کی روشنی میں ہم اس کی بھی تردید کر سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم صرف ایک آیت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کریں گے۔ یہ سورۂ مائدہ کی دوسری آیت ہے جس میں ایمان والوں کو ہدایات دی جا رہی ہیں۔ آیت کا آغاز يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے ہوا یعنی ''اے ایمان والو' پروردگار عالم حرف ندا سے ایمان والوں کو مخاطب کر کے ہدایات دے رہا ہے اور انہیں ہدایات کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (ترجمہ: اے ایمان والو!) نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی اعانت کرو اور ظلم و زیادتی میں ایک دوسری سے تعاون نہ کرو) اس آیت میں مومنوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ نیکیوں میں ایک دوسرے کی اعانت کریں لہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ کے بندے ایک دوسرے سے نصرت بھی طلب کر سکتے ہیں اور اعانت بھی۔ اب ہمارے لئے اور بھی ضروری ہو گیا کہ ''ایاك نستعین'' کے حقیقی مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کیوں کہ ہر نماز میں ہم اپنے مالک حقیقی سے یہ کہتے ہیں کہ پروردگارا! ہم صرف تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں اور اس دعویٰ کے باوجود ہمارا عمل یہ ہے کہ قدم قدم پر بندوں سے طالب امداد ہوتے ہیں آخر یہ معمہ کیا ہے؟

اس منزل پر پہنچ کر ایک آخری دعویٰ یہ کیا جا سکتا ہے کہ بے شک اللہ کے بندے ایک دوسرے سے نصرت بھی طلب کر سکتے ہیں اور اعانت بھی بشرطیکہ ہم جس سے مدد مانگ رہے ہیں وہ بقیدِ حیات ہوں۔ آیت مردوں سے طلب نصرت و اعانت کی ممانعت کر رہی ہے جو اپنا سفر حیات ختم کر کے اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ ان مردوں سے دعا نہیں مانگی جا سکتی۔ حاجات طلب نہیں کی جا سکتیں۔ اب اس مسئلہ پر ہماری وضاحت حسب ذیل ہے۔

ہم قرآن حکیم کو گواہ کر کے یہ کہتے ہیں کہ ہم نے کبھی مردوں کو نہیں پکارا۔ ہم نے کبھی مردوں سے اپنی حاجات طلب نہیں کیں اور نہ آئندہ کبھی ایسا کریں گے۔ ہم اس امر سے حق سبحانہ و تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم مردوں کو پکاریں یا ان سے اپنی حاجات طلب کریں۔ ہم جن بزرگوں کو پکارتے ہیں اور اپنی حاجتوں کے لئے جنہیں وسیلہ بناتے ہیں وہ مردہ نہیں ہیں بلکہ حیات جاودانی رکھتے ہیں اور اللہ انہیں رزق عطا کر رہا ہے۔ قرآن حکیم کی کم از کم دو محکم آیتیں اس حقیقت کی شاہد ہیں سورۂ بقرہ کی آیت نشان (۱۵۴) میں ارشاد رب العزت ہے کہ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم (ان کی زندگی کا) شعور نہیں رکھتے (ترجمہ ختم) اس آیت میں نہ صرف شہیدانِ راہ خدا کو زندہ کہا گیا ہے بلکہ مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ انہیں ''مردہ'' نہ کہو حیات شہدا پر یہ آیت حرف اول بھی ہے اور حرفِ آخر کا کام بھی دے سکتی ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے استدلال میں کوئی ضعف یا تشنگی باقی نہ رہے لہٰذا اب ہم ایک اور آیت کی طرف اپنے قارئین کرام کی توجہ مبذول کر رہے ہیں۔ سورہ آلِ عمران کی آیت نشان (۱۶۹) میں ارشاد ہوا۔ وَلَا

تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے گئے انہیں مردہ گمان تک نہ کرنا۔ بے شک وہ زندہ ہیں اور اپنے رب سے رزق پا رہے ہیں۔ ترجمہ: اس آیت میں کلمۂ لَا تَحْسَبَنَّ پر غور کیجئے۔ یہ نون تاکید ہے اور نفی کی تاکید کے لئے آیا ہے۔ یعنی تم "یہ گمان تک نہ کرنا" "کبھی یہ واہمہ بھی اپنے دل میں نہ لانا کہ شہید راہ خدا مردہ ہیں" سورہ بقرہ کی آیت میں جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے ارشاد ہوا تھا کہ لَا تَقُوْلُوْا شہیدانِ راہ خدا کو مردہ نہ کہو اور آلِ عمران کی اس آیت میں تاکید کی گئی ہے انہیں مردہ گمان تک نہ کرو۔ ان دو آیتوں کے پیش نظر شہیدانِ راہ خدا کو مردہ کہنا یا اپنے دل میں مردہ گمان کر لینا حکمِ الٰہی سے روگردانی ہے۔ انہیں نہ مردہ کہا جا سکتا ہے نہ مردہ سمجھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہم جب شہیدانِ راہ خدا کو حرف ندا سے پکارتے ہیں یا انہیں اپنی دعاؤں کا وسیلہ قرار دیتے ہیں تو ہمارا یہ عمل نہ آیات قرآن سے متصادم ہے نہ بزرگان دین کے طریقون کے خلاف ہے۔ ہمارے اس تمام استدلال کے خلاف ہمارا حریف فکر ونظر یہ کہتا ہے کہ ہم نے مانا کہ بے شک حیاتِ شہداء مسلمات میں سے ہے اور ہم بھی اس پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ شہیدانِ راہ خدا "زندہ جاوید" ہیں لیکن یہ کہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ جب ہم پکارتے ہیں تو وہ ہماری آواز سنتے ہیں اور ہمارا وسیلہ بنتے ہیں۔ وہ زندہ ہیں لیکن آیت کہہ رہی ہے اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یعنی اپنے پروردگار کے حضور میں زندہ ہیں اور اسی سے اپنا رزق پا رہے ہیں۔ بے شک وہ زندہ ہیں لیکن ان کی زندگی ملاء اعلیٰ تک یا عالم بالا تک محدود ہے اور ہمارے اور ان کے درمیان جذب وارسال کا رابطہ موجود نہیں۔ نہ وہ ہماری آواز سن سکتے ہیں اور نہ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔

مذکورہ دلیل بہ ظاہر منطقی اور معقول ہے لیکن درحقیقت فکرِ ناقص کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ يُرْزَقُوْنَ پر وقف کر کے نکالا گیا ہے۔ اور يُرْزَقُوْنَ کے بعد جو علامت وقف ہے۔ اس پر 'لا' کا نشان ہے یعنی یہاں نہ ٹھہرو یہاں ٹھہر کر آیت کا مفہوم سمجھنے کی کوشش نہ کرو کیوں کہ بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ آیت کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے آگے کے الفاظ پر تدبر کرو۔ چنانچہ اس کے بعد والی آیت نشان (۱۷۰) میں ارشاد ہوا فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ جو نعمتیں عالم بالا میں انہیں یعنی شہیدانِ راہِ خدا کو ملی ہیں وہ ان پر مسرور ہیں، فرحت محسوس کر رہے ہیں۔ واضح ہو کہ شہیدوں کی حیات کی نوعیت خواہ کیسی ہی ہو وہ فرحت و انبساط کا شعور رکھتے ہیں۔ فرحین کا لفظ اس امر پر دلیل ہے۔

اب آیت آگے بڑھی اور ارشاد ہوا يَسْتَبْشِرُوْنَ یعنی یہ شہدائے راہِ خدا بشارت طلب کر رہے ہیں۔ نہ صرف مسرور بلکہ بشارت طلب کر رہے ہیں۔ کس سے؟ آیت آگے چل کر بتاتی ہے بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ جو ان کے ساتھ درجہ شہادت پر فائز ہو کر ان کی موجودہ منزل تک نہ پہنچ سکے اور اسی دنیا میں اپنے سفر حیات کا باقی حصہ طے کرنے کے لئے دنیا میں رہ گئے۔ یہاں بشارت طلب کرنے کے ساتھ بشارت دینے کا مفہوم بھی نکل سکتا ہے اور وہ بشارت کیا ہے۔ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کہ شہیدانِ راہ خدا کو نہ کوئی خوف ہے، نہ حزن وملال ہے۔ اب يَحْزَنُوْنَ پر آیت ختم ہوئی اور چونکہ یہ وقف تام ہے، اس لئے اب آیت کا مفہوم نکالا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ عالم بالا میں اپنی حیات جاودانی میں شہیدانِ راہِ خدا کا شعور واحساس عالم بالا یا ملاء اعلیٰ تک محدود و مقید نہیں بلکہ وہ اس منزل رفیعہ پر پہنچ کر بھی اپنے بچھڑ جانے والے دنیاوی ساتھیوں کو نہیں بھولے ہیں۔ دنیا کے دوستوں کے ساتھ ان کا تعلق خاطر برقرار ہے اور ان دیرینہ رفیقوں کی خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ ان کے دلوں میں باقی ہے جس کا وہ اظہار کر رہے ہیں اور حق سبحانہٗ تعالیٰ ان کے جذبات وتاثرات کی خبر، ہمیں آیت کے ذریعہ پہنچا رہا ہے اور عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ شہیدوں کے یہ تاثرات اور خیرخواہی کے جذبات اپنے ان ساتھیوں تک محدود نہ رہیں جو اس دنیا میں ان کے ساتھ تھی بلکہ یہ

تاثرات ان کے لئے بھی ہوں جو مستقل عالم میں جذبۂ ایمان و ایثار و قربانی میں ان کے ساتھی ہوں خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں یا کسی صدی میں ہوں پس آیاتِ قرآنی کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ شہیدانِ راہِ حق کا ذہنی تعلق مومنوں سے باقی رہتا ہے اور وہ مومنوں کے خیر خواہ ہوتے ہیں اب یہ بڑی احسان فراموشی کی بات ہوگی کہ شہید ہمیں یاد کریں اور ہم ان کے اس جذبہ کا احترام نہ کرتے ہوئے بس اسی یقین پر اکتفا کرلیں کہ وہ زندۂ جاوید ہیں اور جس طرح ان کے جذبات و تاثرات کو اللہ نے آیت کے ذریعہ ہم تک پہنچا دیا اسی طرح وہ قادر مطلق ہمارے جذبۂ امتنان و تشکر کو ان تک پہنچا سکتا ہے کیوں کہ وہ دلوں کا حال جانتا ہے لہٰذا ہمارے اور شہیدوں کے درمیان جذب و ارسال کا رابطہ قائم ہے اور ہماری دعاؤں کی قبولیت کے لئے ان کا وسیلہ محکم اور مسلم ہے۔ ہم نے شہیدوں کے کم سے کم تصرفات بیان کئے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ معصوم شہیدوں کے تصرفات و اختیارات اس سے کہیں زیادہ ہیں لیکن ہم اپنے موضوع سے دور نہیں ہونا چاہتے لہٰذا اسی پر اکتفا کرتے ہیں جو ہمیں اس راہِ فکر پر آگے بڑھا دے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ کے بندوں سے بھی مدد مانگی جا سکتی ہے اور شہیدوں کو بھی حاجت طلبی کا وسیلہ بنایا جا سکتا ہے تو پھر

اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ

کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے غور کیا ہوگا کہ ہم کتنی احتیاط سے راہِ فکر میں آگے بڑھ رہے ہیں ایاك نستعين کا مفہوم سمجھنے میں ہمیں اس کے بعد والی آیت مدد دے گی۔

اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ

پروردگار ہمیں دین کے سیدھے راستے پر قائم رکھ۔ یہ ہے وہ مرحلہ جس میں کامیابی کے لئے ہم اللہ اور صرف اللہ سے مدد مانگ سکتے ہیں اور اس قادر مطلق کے سوا اور کوئی اس مرحلہ میں ہماری مدد نہیں کرسکتا۔ راہ ایمان پر باقی رکھنا یا گمراہی میں چھوڑ دینا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مرضی و مصلحت پر منحصر ہے۔ غیر خدا کو اس مسئلہ میں کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن حکیم کی متعدد آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں :یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ اللہ جسے چاہتا ہے راہ مستقیم کی ہدایت کر دیتا ہے (بقرہ ۱۴۲) وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمۡ فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس قوم کی زبان جاننے والا تا کہ ان پر (احکام شریعت) کو واضح کر دے پس اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے (ابراہیم آیت نشان ۴) ان کے علاوہ اور بھی آیات اسی مفہوم کی موجود ہیں اور پھر انبیاء کا فرض صرف پیغام حق پہنچا دینا ہے وَمَا عَلَیۡنَاۤ اِلَّا الۡبَلٰغُ (اور ہم پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے) اور اب تاریخ ہدایت پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے مذکورہ حقائق اور روشن ہو جاتے ہیں۔ اگر حضرت آدمؑ میں اپنے فرزندوں کو راہ راست پر قائم رکھنے کی طاقت ہوتی تو ہابیلؑ کے خون ناحق سے زمین رنگین نہ ہوتی۔ حضرت نوحؑ میں یہ قوت ہوتی تو طوفان عذاب نہ لایا جاتا۔ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں نہ پھینکا جاتا اور حضرت موسیٰ کی پہلی آواز پر فرعون ایمان لے آتا نہ کہ ڈوبتے وقت کہتا کہ میں مسلمان ہوں چونکہ فرعون کا یہ اعلان ایمان موت کے خوف سے اور عالم اضطرار میں تھا لہٰذا بارگاہ احدیت میں قبول نہیں ہوا۔ ان حقائق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دولتِ ایمان ملنے یا نہ ملنے کا انحصار صرف مشیت ایزدی پر ہے۔ ممکن ہے یہاں یہ شبہ پیدا ہو کہ جب یہ مسئلہ اس کی مصلحت و مشیت ایزدی پر ہے۔ تو پھر ہر بندے کا کفر اور ایمان اللہ کی مشیت کا مظہر ہوا تو پھر ایسی صورت میں جزا اور سزا کا کیا محل ہے؟ ہم اس مسئلہ پر چند جملے کہہ کر آگے بڑھیں گے۔ دراصل اس مسئلہ کی حدیں مسئلہ جبر و قدر سے ملتی ہیں جو بے حد نازک اور پیچیدہ موضوع ہے اور تفہیم کے لئے بہت طویل گفتگو کی ضرورت ہے بہر حال ہم ممکنہ اختصار کے ساتھ اس منزل سے

گذریں گے۔

انسان فاعل مختار ہے۔ متعدد آیات اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ سورۂ دہر کی تیسری آیت فی الحال ہمارے لئے کافی ہے۔ ارشاد ہوا: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (ہم نے اسے راستے سکھا دیئے اب وہ چاہے تو شکر گذار بندہ بن جائے اور چاہے تو کفر اختیار کرے) ہر انسان کی عاقبت از روئے آیات قرآن اس کے ان اعمال پر منحصر ہے جو اس نے بالارادہ کئے ہوں۔ اس بات کو جابجا قرآن میں واضح کر دیا گیا ہے، لیکن اس کے کفر وایمان کا آخری فیصلہ مشیت الٰہی پر منحصر ہوتا ہے اور چوں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ علیم وقدیر ہے اور تمام ماضی وحال اور مستقبل کا علم اس کے ذہن قدرت میں بیک آن مستحضر ہے اور وہ عاقبت امور سے واقف ہے اور اس کا ارشاد یہ بھی ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (بے شک اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا) لہٰذا ہر بندے کے کفر وایمان کا فیصلہ عدلِ الٰہی کے مطابق ہوتا ہے اور اس عادل حقیقی کے فیصلہ میں ظلم کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

پالنے والے ہم (اس مسئلہ میں) صرف تجھ سے مدد چاہتے ہیں کہ:۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

تو ہمیں اسلام وایمان کے سیدھے اور سچے راستے پر قائم رکھ یہ توفیق سوائے تیرے ہمیں اور کوئی عطا نہیں کرسکتا۔ تو جس کی چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔ یہ ہے اس سورۂ مبارکہ کی چھٹی آیت جس میں ہم نے اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے سے دعا کی ہے کہ وہ ہمیں صراط مستقیم پر قائم رکھے اور پانچویں آیت سے اس کے حیرت انگیز ربط کو سطور بالا میں واضح کر چکے ہیں۔

اب قرآن حکیم کی ان تمام آیات پر نظر ڈالئے جن میں اسلام کے اصول وفروع بیان کئے گئے ہیں۔ توحید کا بیان ہے، عدل کا ذکر ہے، نبوت پر گفتگو ہے، امامت کے منصب کا لزوم ہے اور ائمہ حق کا تعارف کرایا گیا ہے، قیامت کے مناظر کی تصویر الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔ نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ سے متعلق احکامات ہیں۔ خمس اور جہاد کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ حرام وحلال کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیکیوں کی ترغیب ہے اور برائیوں سے بچنے کی ہدایت ہے۔ یہ تمام آیات صراط مستقیم کی تفسیر ہیں اور ہم آگے بڑھنے سے قبل ایک بار پھر یہ یاد دلائیں گے کہ سورۂ فاتحہ قرآن مختصر ہے اور باقی ایک سو تیرہ سورے اس کی سات آیتوں کی تفسیر ہیں۔

اب چھٹی اور ساتویں آیات کے درمیان جو ربط ہے اس پر توجہ کریں۔ آپ نے صراط مستقیم پر قائم رہنے کی دعا مانگی ہے۔ یہ دعا فوراً قبول ہوئی ہے۔ اور دو طریقے سے قبول ہوئی۔ ہر تعلیم اور تربیت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک نظری تعلیم جس میں نصاب پڑھا دیا جاتا ہے، اصول وقواعد واضح کر دیئے جاتے ہیں۔ اور یہ پوری تعلیم زیادہ تر زبانی ہوتی ہے۔ تقاریر ودروس پر مشتمل ہوتی ہے اور تعلیم کا دوسرا پہلو ہوتا ہے عملی جس میں نظریات کو عملی جامہ پہنا کر قول وعمل کے ربط کو محکم کیا جاتا ہے اور طالب علم احکام کو سننے کے بعد ان احکام پر عمل کرنے والوں کو دیکھتا ہے اور اس طرح تربیت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ چونکہ ہمارا پروردگار ہمارا مربی ہے اس لئے اس نے ہماری ذہنی تربیت اور روحانی تربیت کا مکمل اہتمام کیا ہے اس نے ہم پر صراط مستقیم کو دونوں طرح سے واضح کر دیا ہے۔ نظری تعلیم بھی دی ہے اور اس نظری تعلیم کے عملی گوشوں کو بھی مکمل طور پر واضح کر دیا ہے۔

قبولیت دعا

آپ نے دعا مانگی۔ پالنے والے ہمیں صراط مستقیم پر قائم رکھ۔ سورہ ختم ہوا اور قرآن حکیم کے دوسرے سورہ بقرہ کا آغاز مقطعات سے ہوا اور پھر ارشاد ہوا ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (اے طالب راہ مستقیم تیری دعا قبول ہوئی۔ یہ ہے وہ کتاب جس کا کوئی کلمہ مشکوک نہیں۔ یہ سب حق ہی حق ہے اسے

پڑھ لے اور صراط مستقیم کو سمجھ لے اور اس کے بعد متقیوں کے ذکر سے صراط مستقیم کا آغاز ہو گیا۔ اس زاویہ فکر سے نہ صرف وہ آیات اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر ہیں جن کا ہم نے کچھ دیر پہلے ذکر کیا بلکہ سورۂ بقرہ سے سورۂ والناس تک پورا قرآن صراط مستقیم کی تفسیر قرار پاتا ہے۔ یہ ہوئی صراط مستقیم کی نظری تعلیم۔

صِراطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیهِم

اور ساتویں اور آخری آیت میں عملی تعلیم کی طرف انسان کی توجہ مبذول کردی گئی۔ آپ نے دعا کی ''پالنے والے ہمیں صراط مستقیم پر قائم رکھ'' اس نے کمال فصاحت و بلاغت سے بتایا کہ یہ صراط مستقیم ان لوگوں کا راستہ ہے جنہیں میں نے نعمتیں عطا کی ہیں۔ ان لوگوں کی زندگیوں کو دیکھ اور ان کے ایمان کامل، صبر وایثار، ثبات، قدم، علم وحلم کو دیکھو اور اسے اپنے لئے نمونۂ عمل بنالو اس طرح تم صراط مستقیم تک قائم رہو گے۔

یہ صاحبانِ نعمتُ کون ھیں

لازمی طور پر یہ سوال ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے کہ یہ ہستیاں جن کا راستہ بسند قرآن سچا راستہ ہے کون ہیں؟ انہیں کیسے پہچانا جائے؟ اگر ہم سے ان کی معرفت میں غلطی ہوگئی تو ہم صراط مستقیم کو نہ پاسکیں گے لہٰذا انہیں پہچان لینا اور اس شناخت میں غلطی نہ ہونے دینا ہمارے لئے لازمی ہے۔ کون ہیں یہ لوگ؟

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ

یہ ساتویں آیت کا دوسرا اور آخری جزو ہے (ترجمہ: ان کی راہ پر نہ چلانا جن پر تیرا غضب نازل ہوا یا جو راہ گم کردہ ہیں (ترجمہ ختم) چونکہ مغضوب اور ضالین کی راہوں سے بچنے کی دعا ہے لہٰذا انتہائی وضاحت کے ساتھ ثابت ہو کہ وہ صاحبان نعمت جن کا راستہ صراط مستقیم ہے، غضب الٰہی اور گمراہی سے اتنا دور ہیں جتنا دور رہنے کا حق ہے۔ چونکہ گناہوں کے سبب غضب الٰہی نازل ہوتا ہے اور گناہ اور گمراہی دونوں ''رجس'' ہیں لہٰذا یہ صاحبانِ نعمت وہ ہستیاں ہیں جنہیں اللہ نے رجس سے اتنا دور رکھا ہے جو دور رکھنے کا حق ہے اور مفسروں کی اکثریت کا اس پر اتفاق ہے کہ بسند آیۂ تطہیر یہ ہستیاں اہلِ بیتؑ رسولؐ ہیں۔ اور ان کا راستہ صراط مستقیم ہے اور ساتویں آیت کا یہ دوسرا اور آخری جز اس اہم حقیقت پر بھی دلالت کرتا ہے کہ یہ ہستیاں معصوم ہیں کیوں کہ مغضوب اور ضالین سے بحد امکان دور ہیں۔ دانستہ گناہ میں مبتلا رہنے والے، سرکشی کرنے والے، کافر و ظالم مغضوب ہیں، کیوں کہ ان پر ان کے گناہوں کی پاداش میں غضب الٰہی نازل ہوتا ہے اور ''ضالین'' وہ ہیں جنہیں اپنی گمراہی کا علم نہیں ہوتا لیکن اس بے راہ روی کی ذمہ داری انہیں پر ہوتی ہے یعنی ضالین وہ ہیں جو نادانستہ گناہوں میں مبتلا ہیں اور چونکہ اہل بیتؑ مغضوب و ضالین سے بحد امکان دور ہیں اس لئے نہ وہ دانستہ گناہ کرتے ہیں اور نہ ندانستہ یعنی

صاحبان نعمت عصمت مطلقہ کے منصب پر فائز ھیں

نہ ان سے گناہ ممکن ہے اور نہ خطا وسہو ونسیان۔ ان کی زندگی صراط مستقیم کا عملی نمونہ ہے کیوں کہ اللہ نے ان کے راستہ کو صراطِ مستقیم کہا ہے اور اگر ہمارے اس استدلال سے جو محکم ہے ذہن پوری طرح مطمئن نہ ہوا ہو تو ہم ایک دوسرے راستہ سے اسی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔

صاحبانِ نعمت کون ھیں؟

صاف ظاہر ہے کہ یہ وہی ہستیاں ہوں گی جنہیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے نعمتوں سے نوازا ہے۔ لہٰذا ماضی، حال، اور مستقبل پر نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ کن کن لوگوں کے پاس نہ صرف نعمتیں بلکہ نعمتوں کے خزانے نظر آرہے ہیں۔ یہ مشاہدہ بڑا دل شکن اور پریشان کن ہوگا لیکن منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے ان سنگلاخ زمینوں سے آبلہ پا ہی سہی بہرحال گذرنا پڑے گا۔

آپ دیکھیں گے کہ دولت، نعمت، حکومت، عیش وراحت جن لوگوں کے پاس نظر آتی ہے ان میں نمرود ہے، فرعون ہے،

قارون ہے، ہامان ہے وغیرہ وغیرہ۔ باقی نام آپ خود سوچ لیں۔
یہ ہوا ماضی کا حال اور مستقبل کا علم تو صرف اللہ کو ہے لیکن حال کا
حال یہ ہے کہ بقول علامہ اقبالؒ ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

تو اب سوال کے جواب کے لئے کہ یہ صاحبانِ نعمت کون ہیں جن کا راستہ صراط مستقیم ہے اور جن کا حوالہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اس سورۂ مبارکہ میں جو ہمیں زندگی بھر نماز میں پڑھنا ہے؟ کون ہیں یہ ہستیاں جن کا ذکر جز ونماز ہے؟ کون ہیں یہ ذی مرتبہ افراد جن کے بارے میں مسلسل یاد دہانی کی جاتی ہے؟ کون ہیں یہ بزرگ جن کی راہِ حیات کی طرف ہماری توجہ مسلسل مبذول کی جارہی ہے؟ کون ہیں یہ رہبرِ انسانیت جن کے نقشِ قدم پر ثابت قدم رہنے کی دعا ہم ہر نماز میں مانگتے ہیں؟ کون ہیں یہ خاصانِ خدا جنہوں نے اپنا سفرِ حیات اس طرح طے کیا کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے اسے دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے تا قیامت قابلِ تقلید بنا دیا؟

اس اہم اور بنیادی سوال کا جواب صرف قرآن ہی دے سکتا ہے۔ اب اگر قرآن پر اس عنوان سے نظر ڈالی جائے کہ ہم اس کی آیتوں کی روشنی میں صاحبانِ نعمت کو پہچان لیں تو ہم یہ دیکھیں گے کہ تقریباً بہتر آیات میں نعمتوں اور نعمت پانے والوں کا ذکر ہے اور سرسری تدبر سے بھی واضح ہوجائے گا کہ مذکورہ نعمتیں بندوں کو بغرض امتحان و آزمائش عطا کی گئی ہیں کہ بندے ان نعمات کا کیسا صرف کرتے ہیں کہ امتحان و آزمائش کے مقصد سے نعمتیں پانے والوں کو صاحبانِ صراط مستقیم نہیں کہا جا سکتا۔ سورۂ انعام کی آیت نشان ۱۶۵ میں جو اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت ہے، ارشاد ہوا: وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ترجمہ: وہ وہی پروردگار ہے جس نے تمہیں زمین پر تصرف عطا فرمایا اور ایک کو دوسرے پر درجات و مناصب میں فضیلت دی تا کہ جو کچھ تمہیں عطا کیا گیا ہے اس میں تمہیں آزمائے (ترجمہ ختم) اس آیت سے اور کئی دوسری آیتوں سے یہ واضح ہو گیا کہ اللہ نے بندوں کو بیشتر نعمتیں آزمائش کے لئے عطا کی ہیں۔

مذکورہ بہتر (۷۲) آیات میں صرف ایک آیت ایسی ہے جو ہماری تلاش کو ختم کر دیتی ہے۔ یہ سورہ نسا کی آیت نشان (۶۹) ہے۔ اس آیۂ کریمہ کو بار بار پوری توجہ سے پڑھیں۔ ارشاد ہوا: وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا (ترجمہ: اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جنہیں اللہ نے نعمتیں عطا کی ہیں (اور یہ صاحبانِ نعمت) انبیاؑء میں، صدیقوں میں اور شہیدوں میں اور صالحین میں اور یہ بہت اچھے رفیق ہیں (ترجمہ ختم) آیت نے واضح طور پر صاحبان نعمت کا اعلان کر دیا اور کہہ دیا کہ اگر صاحبانِ نعمت کی تلاش ہے تو انہیں انبیاؑء اور مرسلینؑ میں ڈھونڈھو، سچوں میں دیکھو، شہدأ میں پہچانو، اور صالحینؑ میں تلاش کرو اور یہ نہ بھولو کہ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۝ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ وہ صاحبانِ نعمت ہیں کہ جو معصومؑ ہیں۔

سب سے پہلے انبیاؑء و مرسلینؑ پر نظر ڈالیں چوں کہ تمام انبیاء و مرسلینؑ معصوم ہیں لہٰذا سب کا راستہ صراط مستقیم ہے اور ہر نبیؑ کی زندگی قابل تقلید ہوگی۔ سب کی عظمت و بزرگی ہمارے سر آنکھوں پر، لیکن چونکہ تمام انبیاؑء کے مکمل سوانحِ حیات کو تاریخ نے قلم بند نہیں کیا ہے۔ اور قرآن میں بھی ان کا سفرِ حیات مفصل طور پر مذکور نہیں، اس لئے قدرت نے ہمارے لئے یہ مشکل حل کردی۔ سورۂ یٰسین کی آیات (۱) تا (۴) میں ارشاد ہوا: يٰسٓ ۝ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ۝ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔ ترجمہ: یٰسین! حکمت والے قرآن کی قسم

(اے محمدؐ) تم رسولوں میں سے ہو (اور) صراط مستقیم پر ہو (ترجمہ ختم) قدرت نے سرکار ختمی مرتبتؐ کے صراط مستقیم پر ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور حرف آخر کے طور پر ہم پر یہ ثابت ہو گیا کہ سرکار ختمی مرتبت صاحبانِ نعمت میں ہیں اور ان کی پیروی ہم پر لازم وواجب ہے۔

اس کے بعد صدیقوں کا یعنی ہمیشہ سچ بولنے والوں کا ذکر ہے لیکن ان میں معصوم اور غیر معصوم دونوں ہو سکتے ہیں اس لئے معصوم صدیقوں کو ڈھونڈھنا پڑے گا کیوں کہ صاحبانِ نعمت کا معصومؑ ہونا ضروری ہے۔ ہمارا مسئلہ سورۂ آلِ عمران کی آیت نشان (۶۱) حل کر دیتی ہے جس میں نصارائے بنی نجران سے مباہلہ کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوا فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ○ اور اے رسول تمہارے پاس علم آجانے کے بعد جو تم سے کج بحثی کرے تو کہو کہ تم اپنے بیٹوں کو لاؤ، ہم اپنے بیٹوں کو لائیں، تم اپنی عورتوں کو لاؤ ہم اپنی عورتون کو لائیں، تم اپنے نفسوں کو لاؤ ہم اپنے نفسوں کو لائیں اور پھر مباہلہ کرلیں۔ پس اللہ کی لعنت بھیجیں جھوٹوں پر (ترجمہ ختم) مفسروں کی اکثریت کا اتفاق ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد سرکار ختمی مرتبتؐ میدانِ مباہلہ میں اپنے ہمراہ علی مرتضیٰؑ، صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہراؑ، حسن مجتبیٰؑ اور حسینؑ مظلوم کو لے گئے، جھوٹوں پر لعنت کے لئے۔ لازمی طور پر رسولِ اکرمؐ انہیں ہستیوں کو لے جائیں گے جن کا صدیق ہونا رسول اکرمؐ کے نزدیک مسلم ہے اور پھر بسند آیۂ تطہیر (احزاب ۳۳) یہ ہستیاں معصوم بھی ہیں۔ لہٰذا اب صاحبان نعمت کی تعداد ختمی مرتبتؐ کو ملا کر پانچ ہوگئی۔

مذکورہ آیت میں اس کے بعد شہداء وصالحینؑ کا ذکر ہے۔ ان میں معصومؑ بھی ہیں اور غیر معصوم بھی اور صاحبان نعمت کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ اب پوری تاریخ اسلام پر نظر ڈال لیجئے اور گذشتہ چودہ سو سال کے اسلامی ادب کا جائزہ لے لیجئے تو واضح ہوجائے گا کہ ائمہ معصومین علیہم السلام ہی وہ ہستیاں ہیں جو بسند آیۂ تطہیر معصوم بھی ہیں اور جنہیں شہید بھی کیا گیا ہے۔ لہٰذا صاحبان نعمت جو سورۂ فاتحہ میں اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے مصداق ہیں وہ ہمارے چودہ معصومینؑ ہیں۔ درود وسلام ہو ان نفوس قدسیہ اور ذواتِ مقدسہ پر۔ سرکار ختمی مرتبت نے دو گراں بہا چیزیں چھوڑیں۔ ایک قرآن، دوسرے اہل بیتؑ اور سورۂ فاتحہ نے یہ ثابت کر دیا کہ قرآن میں صراط مستقیم کی نظری تعلیم ہے اور اہل بیتؑ کی زندگی اس کا عملی نمونہ ہے۔ قرآن علم ہے اور اہل بیت عمل۔ قرآن مصحف صامت ہے، اہل بیتؑ مصحفِ ناطق۔ اگر مسلمان دونوں سے متمسک رہے تو کبھی گمراہ نہ ہوگا یعنی صراطِ مستقیم سے کبھی نہیں ہٹے گا۔